نابغہ خاران حضرت مولانا عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ

آخری علمی مجلس

محمود خارانی
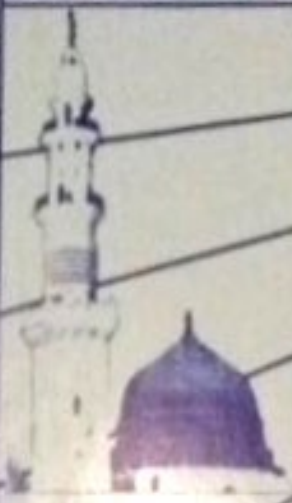
نابغہ خاران حضرت مولانا عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کی آخری لمحات میں
آخری علمی مجلس
محمود خارانی
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی
ناشر
دارالشکور
مدرسہ عربیہ دارالعلوم خاران بلوچستان
رابطہ نمبر: 03327947685،03343637312

فہرست

۱۔ پیش لفظ ---------------------- ۳

۲۔ آخری علمی مجلس ---------------------- ۷

۳۔ عسکریت کے لیے شرط امام ---------------------- ۷

۴۔ حسد پر قیمتی اشعار ---------------------- ۸

۵۔ عربوں کا ذوق شاعری ---------------------- ۸

۶۔ علماء عرب کا علمی شغف ---------------------- ۱۰

۷۔ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے عقیدت ---------- ۱۱

۸۔ بیان میں سامعین کی ضرورت ومزاج کی رعایت ---------- ۱۲

۹۔ جمعہ فی القریٰ کا مسئلہ ---------------------- ۱۳

۱۰۔ حیاتِ مسیح کے منکرین کی تکفیر ---------------------- ۱۴

۱۱۔ چند سیاسی خدمات ---------------------- ۱۵

۱۲۔ جمعیت چھوڑنے پر اظہار افسوس ---------------------- ۱۶

۱۳۔ حرماگئی کا ایک میزبان ---------------------- ۱۷

۱۴۔ پیشکان والوں کی مہمان نوازی ---------------------- ۱۸

۱۵۔ شفقتِ پدری اور شفقتِ مادری میں فرق ---------------------- ۱۹

۱۶۔ الوداعی لمحات اور آخری وصیت ---------------------- ۲۰

پیش لفظ

نابغہء خاران محدث کبیر حضرت اقدس مولانا عبدالشکور شاہوانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۴۷ء - ۲۰۱۵ء) سابق مہتمم دارالعلوم خاران بلوچستان کا معمول تھا کہ نماز عصر کے بعد دارالعلوم خاران کے چمن زار میں آپ جلوہ افروز ہوتے، احباب، تلامذہ اور اساتذہ پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ آپ کی زبان فیض رساں سے علمی نکات ونودرات کا بحر بیکراں موجزن ہوتا، سنجیدہ مباحث کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور ظرافت بھی عروج پر ہوتی۔ اب وہ مجالس یاد کر کے زبان پر بے ساختہ یہ شعر آتا ہے۔

چھین لے مجھ سے نظر اے جلوہ خوش روئے دوست
میں کوئی محفل نہ دیکھوں اب تری محفل کے بعد

یہ مجلس رمضان المبارک میں نماز عصر کے بعد مسجد میں منعقد ہوتی تھی۔ میں سال بھر اس مجلس کا مشتاق ومنتظر رہتا تھا۔ میرے ساتھ غیر معمولی کرم نوازی کرتے ہوئے اس مجلس کو "تبادلہ مطالعہ" کا ذریعہ بناتے۔ آپ اپنے دن بھر کے حاصل مطالعہ سے ہمیں مستفید فرماتے، اور میں بھی اپنا ناقص مطالعہ پیش کرتا، طالب علمانہ سوالات پوچھتا اور آپ جوابات مرحمت فرماتے۔

چنانچہ ۷ رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ بمطابق ۲۴ جون ۲۰۱۵ء بروز جمعرات یہ آپ کی آخری مجلس ثابت ہوئی۔ اتفاق سے اس دن دوسرے احباب شروع ہی میں ایک ایک کر کے اٹھتے چلے گئے۔ البتہ آپ کے نواسے محمد اکرام صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے ہمارا ساتھ دیا۔ پھر وہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ بعد میں حضرت کے ساتھ صرف احقر شریک محفل

رہا۔ وہ مجلس جو صرف پندرہ بیس منٹ کی ہوا کرتی تھی آج ایک گھنٹے سے زائد پر محیط ہوگئی۔ چھ بجے نماز ہوگئی تھی۔ دوران مجلس موبائل میں وقت دیکھا تو 6:53 تھا۔ اس کے بعد بھی مجلس جاری رہی۔

غرض ایک گھنٹے سے زائد تک بڑی شگفتہ باتیں ہوتی رہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ بڑے ہشاش بشاش تھے، چہرے پر نشاط کے آثار تھے اور سنجیدگی کے ساتھ خوش طبعی (جو آپ کی عام عادت تھی) بات بات میں جھلک رہی تھی، بلکہ بعض باتیں نہایت بے تکلفی کے ماحول میں ایسی ہوئیں کہ بار بار محفل کشتِ زعفران بنتی رہی، اُس وقت میرے حاشیہ وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آپ چند گھنٹوں کے مہمان ہیں اور اس کے بعد یہ محفل ہمیشہ ویران ہو جائے گی (حضرت مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کی آخری لمحات میں بالکل اس جیسی کیفیت رہی تھی) علم وفضل کی یہ محفل اُجڑ گئی۔

فصل گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از کہ جویم ؟ از گلاب

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آج میری اس تنہائی میں شاید یہ حکمت پنہاں تھی کہ مجھے اپنے بعض نجی مسائل میں مشاورت کا موقع ملے، نیز حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی پر اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دوں کہ آخری مجلس پانے کا اعزاز اللہ تعالی نے صرف تمہیں بخشا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

بہر حال زیرِ نظر رسالہ ''آخری علمی مجلس'' میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس آخری مجلس کی روداد پیش خدمت ہے، دعا ہے کہ اللہ رب العزت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی جوار رحمت میں اعلیٰ مقامات سے نوازے، ان کی لغزشات اور سیئات کو حسنات اور رفع درجات میں بدل دے اور ہم جیسے پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے اور ان کے علمی فیوضات کو پھیلانے کی توفیق دے۔ (آمین)

اللھم لا تحرمنا أجره ولا تفتنا بعده

قارئین سے گزارش ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مفصل سوانح حیات زیر ترتیب ہے۔ جس کے پاس حضرت سے متعلق کوئی واقعہ، کوئی ملفوظ اور کوئی مواد ہو تو تحریری یا زبانی طور پر احقر تک پہنچانے کی زحمت فرمائے اور دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد اس کام کی بحسن وخوبی تکمیل کی توفیق سے نوازے۔ (آمین)

آخر میں اپنے عزیز دوست، شاعر و ادیب اور معروف مصنف محترم جناب جاذب اسلام صاحب (چیئرمین شعبہ اردو بی آر سی تربت) کے مفید مشوروں اور عملی تعاون کا بہت بہت شکریہ۔

اللہ تعالیٰ اس رسالے کو میرے اور ان کے لیے خوشگوار آخرت کا بہترین ذریعہ بنا دے۔ (آمین)

محمود خارانی

بی۔آر۔سی تربت

یکم ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ بمطابق ۱۶ ستمبر ۲۰۱۵ء

آخری علمی مجلس

عسکریت کے لیے شرطِ امام

خادمِ قرآن محترم جناب قاری محمد حنیف صاحب کی امامت میں نمازِ عصر سے فارغ ہوتے ہی حضرت اقدس مولانا عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ کرسی سے نیچے اتر کر میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ تشریف رکھتے ہی حسبِ معمول پوچھا: ہاں استاد جی! آج کیا مطالعہ کیا ہے؟ میں نے جواباً حدیث پڑھی: انما الامام جنة یقاتل من وراءہ ویتقی بہ۔ کہ یہ بخاری کی روایت ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا: خیال کرنا بخاری کی ایک تجرید شدہ نسخہ میرے پاس بھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ پاکستان میں موجودہ جتنی عسکری تنظیمیں برسرِپیکار ہیں ان میں سے کسی کو امام کی اجازت حاصل ہے نہ سرپرستی تو ان کی جدوجہد کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ مولانا شیرانی بھی اپنے موقف کے لیے ایسی ہی روایات سے استدلال کرتے ہیں۔ میں نے کہا مولانا شیرانی کے موقف کے مطابق جس امام کی شرط ہے وہ تو دنیا میں فی الوقت کہیں بھی موجود نہیں۔ فرمایا کیسے موجود نہیں؟ پھر مزید فرمایا کہ شیرانی کے اپنے دلائل ہیں، لیکن بجائے اس کو جواب دینے کے لوگ حسد کا شکار ہو کر ان پر بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں۔

میں نے کہا جی ہاں مجھے بھی کچھ اہلِ علم حضرات نے بتایا کہ خوستی نامی ایک مولوی صاحب نے باقاعدہ مولانا شیرانی کے خلاف ایک تحریر لکھی ہے جس میں کفریہ عقائد و نظریات کو شیرانی کی طرف منسوب کیا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ سب کچھ حسد اور معاصرت کا شاخسانہ ہے۔

حسد پر قیمتی اشعار

میں نے کہا حضرت میں نے "سلوۃ الحزین" میں حسد کے موضوع پر چند بہترین اشعار دیکھے ہیں اور آپ کو میسج بھی کیا تھا۔ فرمایا مجھے میسج نہیں ملا ہے فرط ذوق وشوق کے ساتھ ان اشعار کے سنانے کی فرمائش کی میں نے عرض کیا:

انی لارحم حاسدی لحر ماوجدوا فی صدورھم
نظروا صنیع اللہ بی فعیو نھم فی الجنۃ و قلوبھم فی نار

یعنی مجھے اپنے حاسدین پر رحم آتا ہے کہ ان کے سینوں میں حسد وکینہ کی آتش سوزاں کی حرارت موجود ہے۔ اللہ نے مجھے جن نعمتوں سے نوازا ہے وہ انہیں دیکھتے ہیں تو انکی نظریں جنت میں ہوتی ہیں اور دل جہنم میں۔

یہ اشعار سن کر وجد آفریں انداز میں عش عش کہہ اٹھے اور فرمایا: کہ کمال کیا ہے اس شاعر نے

عربوں کا ذوقِ شاعری

اس سلسلے میں میں نے عرض کیا کہ: والجہ! عربوں کا شعر کے بارے میں عجیب و غریب ذوق ہے، اشعار کہنے کا اتنا شوق ہے کہ گدھے کی موت پر بھی مرثیہ کہتے تھے۔ ابوالحسن الجزار مصری کا گدھا مر گیا تو اس پر بھی اس نے طویل مرثیہ کہا۔ جس کی وجہ سے اس کے دوست شاعروں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ میں نے مزید کہا کہ عرب شعراء میں خواتین کا کمال بھی باعثِ حیرت ہے، کھڑے کھڑے اشعار وضع کیے اور اسی موقع پر حسب ضرورت فوراً ایسی تبدیلیاں بھی کر ڈالیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ آج کا مطالعہ ہے کہ ایک آدمی فوت ہوگیا۔ اس کی بیوی نہایت غمزدہ تھی، اپنا غم غلط کرنے کی غرض سے اپنے باپ کے باغ میں سیر وتفریح کے لیے چلی گئی، وہاں پر شوہر کی یاد ستانے لگی تو اس کی یاد میں یہ اشعار بلند آواز کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

انما أبکی لالف		خانه الدهر فماتا
قلت للدهر بحزن		ایها الدهر أساتا
لم ترکت الاب و الاخ		وبالزوج قد بدأتا

ترجمہ: میں اس محبوب شوہر کے لیے آنسو بہا رہی ہوں جسے زمانہ نے مجھ سے جدا کر دیا۔ غمگین لہجے کے ساتھ میں نے زمانے کو مخاطب کیا کہ تم نے بہت بُرا کیا، کیوں تم نے میرے باپ اور بھائی کو چھوڑ کر میرے شوہر کو مجھ سے علیحدہ کر دیا۔

یہ اشعار کہنے کے بعد عورت نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ والد صاحب کھڑے سن رہے ہیں۔ والد نے پوچھا تم کیا کہہ رہی تھی۔ فوراً بولی میں نے آڑو کے درخت کے پتوں کو جھڑتے دیکھا تو اس سے متاثر ہو کر کہا کہ:

انما أبکی لخوخ		خانه الدهر فماتا
قلت للدهر بحزن		أیها الدهر اساتا
لم ترکت الزرع والکرم		وبالخوخ قد بدأتا

شوہر کی جگہ خوخ یعنی آڑو کے درخت کا لفظ لایا اور باپ اور بھائی کی جگہ زرع کھیت اور کرم انگور کے باغ کے الفاظ استعمال کئے۔ کلام میں اس فوری اور فی البدیہہ تبدیلی پر باپ کو اتنا تعجب ہوا کہ وہ باغ اُسے ہبہ کر دیا۔

یہ واقعہ سن کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ بہت ہنسے اور فرمایا کہ ہاں! عرب لوگ عشق و شاعری میں تمام رشتوں کو بالائے طاق رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے علامہ ابن جوزی کے لطائف علمیہ کے حوالے سے محبت کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک آدمی کو اپنی چچا زادی سے عشق ہو گیا تھا وہ خاتون شادی شدہ بھی تھی۔ ایک دن اُس نے ایک چھوٹے بچے کو چند ایسے اشعار یاد کروا کر اس عورت کے پاس بھیجا جن میں کوئی خاص پیغام پنہاں تھا۔ عورت نے بچے سے اشعار سن کر اس کا جواب بھی اشعار ہی میں دیا۔ گھر کے کسی کونے میں اس کی ماں نے اشعار کا یہ تبادلہ سن لیا

تو اس نے بھی فوراً اشعار ہی میں اپنا ردِّ عمل یوں دیا کہ میری موجودگی میں کسی اونٹ کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کھیت کو پامال کر سکے۔ یہ تمام شاعرانہ گفتگو کہیں سے سن کر شوہر طیش میں آ گیا اور طلاق دیدی۔ بعد میں فریقین عشق کی شادی ہو گئی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے پوچھا کہ قدیم زمانے میں تو عربوں میں واقعتاً ایسا ہی شعری ذوق تھا کیا آج کل کے عربوں میں بھی اُسی طرح کا شاعرانہ ذوق اب بھی موجود ہے، اسی انداز اور اسی معیار کا؟ فرمایا: ہاں بالکل آج بھی عرب مرد و خواتین میں اس جیسا شاعرانہ ذوق و اسلوب اپنی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔

علماء عرب کا علمی شغف

فرمایا: علماء عرب کا علمی ذوق اور جذبہ تحقیق اب بھی قابلِ داد ہے، شب و روز وہ علمی و تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں، کہیں تصنیف و تالیف ہو رہی ہے کہیں تخریج و تعلیق کا کام جاری ہے۔ کوئی تقدیم و تحشیہ میں مصروف ہے تو کوئی تجرید و تلخیص میں مشغول ہے، الغرض علمی مصروفیات کا سدا بہار سلسلہ جاری و ساری ہے۔ میں نے عرض کیا: کہ پاکستان میں علماء کے اندر علمی ذوق و جستجو کے فقدان پر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے بڑے افسوس کا اظہار فرمایا ہے اور یہ واقعہ ارشاد فرمایا کہ "میری کتاب القضایا الفقھیہ المعاصرہ پہلی دفعہ کراچی سے ایک ہزار کی تعداد میں چھپ گئی، جن کے ختم ہونے میں تین سال کا عرصہ لگ گیا۔ اسی کتاب کی جب عرب دنیا میں پہلی دفعہ طباعت ہوئی تو پانچ ہزار کی تعداد میں چھپ گئی اور یہ پانچ ہزار کا پیاں تین مہینے کے اندر ختم ہو گئیں"۔

یہ بات سن کر حضرت نے فرمایا: "ہاں! بالکل ایسی ہی صورت حال ہے ہمارے اہل علم طبقے میں مطالعہ کا رجحان ہی نہ رہا، زیادہ سے زیادہ کہیں کسی اردو رسالہ کی ورق گردانی کی تو ٹھیک ورنہ عربی مآخذ و کتب سے بالکل سروکار نہیں رکھتے"۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب سے عقیدت

چند دن پہلے میں نے حضرت کو بتایا تھا کہ شیخ الاسلام کی نئی فاضلانہ تصنیف ''فقہ البیوع علی المذاہب الاربعہ'' منظر عام پر آگئی ہے تو حضرت نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اس کتاب کا نام انھیں میسج کروں تاکہ کراچی میں حافظ علی احمد صاحب کو خریدنے کا کہہ دے۔ اسی سلسلے میں آج میں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ ابھی تک حافظ صاحب سے رابطہ نہیں ہو پا رہا، آج نمبر ملایا تھا مگر بات نہ ہو سکی۔

شیخ الاسلام کے تذکرے میں مزید فرمایا کہ: ''بھئی! تقی، تقی ہے، کسی زمانے میں علمی دنیا میں حضرت مفتی محمد شفیع کا طوطی بولتا تھا اور ہر مسئلے میں ان کی رائے حرف آخر کے طور پر قبول کی جاتی تھی۔ مگر مفتی محمد تقی صاحب اپنے والد مرحوم سے بھی سبقت لے گئے ہیں، علمی طور پر ان کا مقام نہایت بلند و ممتاز ہے''۔

میں نے کہا کہ حضرت یہی بات خود حضرت مفتی محمد شفیع نے اپنی حیات میں اساتذہ کی ایک مجلس میں کہی ہے کہ ''تقی میاں کو معمولی نہ سمجھنا یہ ابھی سے علمی طور پر مجھ سے آگے ہیں''۔

دوبارہ موضوع سخن مطالعہ کی طرف مڑ گیا اور دارالعلوم خاران کے ایک محترم استاد کا نام لیکر ارشاد فرمایا کہ انھیں مطالعہ کا تھوڑا بہت ذوق ہے اور مجھ سے کتابیں لے کر مطالعہ کے لیے لے جاتا ہے۔ دیگر نوجوان فضلاء میں سے بطورِ خاص مولوی محمد اکرام صاحب کا تذکرہ فرمایا کہ ان کے ساتھ مجھے قلبی لگاؤ ہے دو وجہ سے ایک اس وجہ سے کہ وہ کالا ہے (تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ کالے لوگ فطری طور پر مجھے بے حد پسند ہوتے ہیں) دوسری وجہ ان کا ذوق مطالعہ ہے۔ میری کوشش ہے کہ میر صاحب (یعنی میر دوست محمد محمد حسنی صاحب) سے اُن کی ٹرانسفر کے حوالے سے بات کروں تاکہ یہاں شہر میں آکر دارالعلوم میں ان کی خدمات لی جائیں۔

میں نے کہا: ''ہاں حضرت! مولوی اکرام صاحب بہترین مدرس، کتاب دان عالم اور بلوچی کے شاعر ہیں'' اس پر اظہار مسرت فرمایا۔ اس کے بعد میرے کچھ نجی نوعیت کے مسائل زیر بحث آئے اور حضرت نے رہنمائی فرمائی۔

بیان میں سامعین کی ضرورت و مزاج کی رعایت

بیان وخطابت کے ایک اہم اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے واعظین اور خطباء عموماً پرانے موضوعات اور مواد پر اکتفا کرتے ہیں نیا مطالعہ اور نئی تحقیق کا رجحان بہت کم ہے۔ دارالعلوم خاران میں ہفتہ وار خواتین کے لیے اصلاحی بیان کا جو سلسلہ جاری ہے، اس حوالے سے میں نے ایک دفعہ حضرت مفتی صاحب کو علامہ ابن جوزی کی کتاب احکامِ النساء دے دیا کہ خواتین کی عملی ضروریات اور ان کے مخصوص مسائل کے لحاظ سے یہ ایک بہترین کتاب ہے اسی سے بیان ہوجائے تاکہ عملی زندگی میں ان کے بہت سارے مسائل براہ راست اور فوری حل ہوجائیں۔

مزید فرمایا ''البتہ مولانا محمد یوسف صاحب کا مطالعہ کسی حد تک تازہ رہتا ہے اور وہ مطالعہ کا شوقین بھی ہے اور ان کی یہ ادا بہت اچھی ہے کہ مواد لکھ کر سامنے رکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں، اس سے مطالعہ میں تحقیق بھی پیدا ہوتی ہے ساتھ ساتھ استناد بھی۔۔۔۔۔ دراصل ہم لوگ مطالعہ کرتے نہیں اس لیے نئی باتیں اور نئی موضوعات سامنے نہیں آتی ہیں''۔

اسی اثناء میں فرمایا کہ اب کسی کو مطالعہ کے لیے کتاب دیتے وقت ڈر لگتا ہے کہ وہ واپس نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ بخل نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ بعد میں جب خود مجھے کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے جس کے حل کے لیے اسی کتاب کی طرف مراجعت ضروری ہوتی ہے جو ابھی تک اُس صاحب نے واپس نہیں کیا ہوتا تو شدید پریشانی لاحق ہوجاتی ہے۔ اس لیے اب میں کسی کو کوئی کتاب نہیں دیتا۔

جمعہ فی القریٰ کا مسئلہ

احقر سے پوچھا کہ آپ کے استاد (حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہم) کی کتاب جمعہ فی القریٰ کا کیا بنا؟ میں نے کہا وہ تو چھپ گئی ہے فرمایا مجھے تو ابھی تک نہیں ملی ہے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس بھی صرف ایک نسخہ ہے اور فی الحال تربت میں ہے۔ تو فرمایا: میں اس کتاب کا جواب لکھوں گا۔ میں نے کہا حضرت آپ کا اپنا فتوی جواز پر موجود ہے اور میں نے خود ایک رسالہ میں ملاحظہ کیا ہے۔ تو مسکرا کر بطور مزاح فرمایا "ہاں میں نے بھی جواز کا فتوی دیا ہے مگر اب کروچ کروچ (بطور مذاق اپنا موقف چھوڑنا) کرتا ہوں۔

پھر ذرا سنجیدہ ہو کر ارشاد فرمایا کہ میں دراصل اذن حاکم وقاضی کے ساتھ جمعہ فی القریٰ کے جواز کا قائل ہوں۔ جہاں بھی میری سرپرستی میں جمعہ جاری ہوا ہے وہاں قاضی اور حاکم سے اجازت لے کر اجراء کیا گیا ہے۔

میں نے کہا حضرت! ویسے اگر گاؤں دیہات کی دینی حالت پر نظر ڈالی جائے تو جواز کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تو فرمایا کہ مفکرِ اسلام علامہ ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ارکانِ اربعہ میں اسی نکتے کو جواز جمعہ کی ایک بنیاد قرار دیا ہے۔ احقر نے کہا کہ ان کا یہ اقتباس میں نے خود آپ کے تحریر فرمودہ فتوی میں دیکھا ہے۔

پھر فرمایا کہ جس زمانے میں میں سلام بیک جمعہ پڑھانے کے لیے جایا کرتا تھا، اس وقت وہاں جمعہ میں جمِ غفیر جمع ہوتا تھا۔ ناوڑ، شمشان، تالو، ہڈ واور سورے آمگ وغیرہ آس پاس کے بہت سے دیہاتوں سے لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ میں نے کہا: اب لوگوں میں وہ ذوق واہتمام جمعہ کا نہیں رہا۔ مضافات کے لوگ بہت کم تشریف لاتے ہیں۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ میرے بعض مخصوص اور ذاتی نوعیت کے مسائل کی طرف مڑ گیا۔

حیاتِ مسیح کے منکرین کی تکفیر

فرمایا: ''ایک دفعہ اساتذہ کی زیارت کے لیے دار الہدیٰ ٹیڑھی سندھ میں حاضر ہوا۔ عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اتفاق سے مولانا منظور احمد چنیوٹی بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ اُس زمانے میں وہ حیاتِ عیسیٰ کے منکرین پر کفر کے فتویٰ پر علماء کرام سے دستخط لینے کا مہم چلا رہے تھے۔ ٹیڑھی میں بھی اسی مقصد کے لیے تشریف لائے تھے۔ اساتذہ کرام سے ان کی علمی گفتگو اور بحث جاری تھی، درمیان میں میں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا''۔ (تبسم آمیز انداز میں فرمایا کہ میں بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھ رہا تھا) چنانچہ میں نے حضرت چنیوٹی سے کہا کہ'' آپ کے اس فتویٰ کی زد میں مولانا عبید اللہ سندھی بھی آتے ہیں''۔ مولانا چنیوٹی نے فرمایا: کیسے؟ میں نے کہا: ''حضرت سندھی نے اپنی تفسیر الہام الرحمٰن میں جہاد کی بحث کے ذیل میں رجل موھوم مثل مھدی و مسیح لکھا ہے یعنی حضرت مسیح کو رجل موھوم قرار دیا ہے''۔ تو حضرت چنیوٹی نے فرمایا کہ'' جو بھی شخصیت فتویٰ کی زد میں آجائے، ہمیں اس کی پرواہ نہیں''۔ اس پر جامعہ کا ایک استاد میری تائید میں کھڑے ہوگئے اور مدلل انہ مخالفت میں بولنے لگے۔ حقیقتِ حال جاننے کے لیے اسی دوران شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ناظم مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا، انہوں نے بھی تفسیر الہام الرحمٰن میں اس عبارت کی موجودگی کی تصدیق کی اور ساتھ ہی واضح طور پر اساتذہ کو متنبہ کیا کہ''اس فتویٰ پر ہرگز دستخط نہ کیے جائیں ورنہ ہمارے اور آپ کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوگا''۔

یہ واقعہ سن کر میں (راقم الحروف) ذرا حیرت میں مبتلا ہوگیا تو حضرت نے فرمایا: دراصل تفسیر الہام الرحمٰن حضرت سندھی کی اپنی تحریر کردہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کے ایک شاگرد مولانا موسیٰ جار اللہ نے حضرت سندھی کی درسی تقریر کو قلمبند کر کے کتابی شکل دی ہے جو بعد میں الہام الرحمٰن کے نام سے شائع ہوگئی۔

حضرت نے مزید فرمایا کہ "میں ایک دفعہ مکران میں مولانا محمد حیات صاحب مرحوم (جو مولانا عبدالحق بلوچ کے والد گرامی تھے) سے اس عبارت کے بارے میں استفسار کیا، جو براہ راست حضرت سندھی کے شاگرد رہ چکے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ۔۔۔۔۔ یہ عبارت مولانا موسیٰ جاراللہ کی طرف سے خود ساختہ اضافہ ہے اور مولانا سندھی پر بہتان ہے۔ جس کا مولانا سندھی کے نظریات و عقائد سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں۔۔۔۔۔" حضرت کہتے ہیں کہ "مولانا محمد حیات کی یہ وضاحت سن کر مجھے اطمینان ہوا کہ حضرت سندھی حیات مسیح کے منکر نہ تھے، بلکہ ان کی تفسیر میں تحریف سے کام لیا گیا ہے" س۔

چند سیاسی خدمات

نیز ھی کے ذکر سے مولانا غلام مصطفیٰ مرحوم گدر سوراب والے کا تذکرہ شروع ہوا تو فرمایا کہ نیز ھی کے زمانہ طالب علمی میں وہ ہم جیسے بے ریش طلباء کا سندھی طلباء کے ساتھ اختلاط پر سخت نالاں تھے اور از راہ خیر خواہی بارہا ہمیں منع بھی فرمایا مگر ہم یہی جواب دیتے رہے کہ آپ بلا وجہ بدگمانی میں مبتلا ہیں۔ کئی سال بعد ایک دفعہ مدینہ منورہ میں حج کے دوران ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں یاد دلا کر کہا اپنی اُس بدگمانی پر حرم نبوی ﷺ میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لو اور توبہ کرو تو ان کے آنسو نکل گئے اور استغفار کرتے ہوئے کہا کہ بے شک میں بلا وجہ بدگمانی کا شکار تھا۔

آپ نے مزید فرمایا کہ مولانا غلام مصطفیٰ مرحوم نے اپنی وزارت تعلیم کے دوران ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا۔ میں نے خاران کے لیے ایک دن میں چودہ (۱۴) پرائمری سکولوں اور اٹھارہ (۱۸) ملازمتوں کی منظوری ان سے حاصل کر لی اور کہا کہ آپ کے گاؤں سلام بیک کا مڈل سکول بھی میں نے انہی سے منظور کرایا تھا جس کی کہانی بہت طویل ہے۔

جمعیت چھوڑنے پر اظہارِ افسوس

میں نے عرض کیا حضرت! خاران اور واشک میں آپ کے تلامذہ کا وسیع حلقہ موجود ہے، جن میں سے کئی تلامذہ کو آپ نے نوکریاں بھی دلوائیں مگر اب وہ جمعیت کو داغ مفارقت دے کر دوسری پارٹیوں میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔ تو نہایت افسوس کے ساتھ آپ نے فرمایا: ''یہ ان کا اپنا فیصلہ اور ان کی اپنی کمزوری ہے، ضرور اللہ تعالیٰ ان سے باز پرس کرے گا''۔

اس کے بعد میرے کچھ ذاتی نوعیت کے امور زیرِ بحث آئے، تشفی آمیز انداز میں گفتگو فرماتے رہے اور آخر میں مجھ سے کہا کہ آپ انتہائی شرمیلی طبیعت کے مالک ہو۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ سفر کرے تو آپ خود بھی بھوکا مرو گے اور اس رفیقِ سفر کو بھی مرواؤ گے۔ پھر اسی موضوع پر اپنے نہایت دلچسپ واقعات سنائے جو درج ذیل ہیں۔

حرماگئی کا ایک میزبان

فرمایا: ''میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کسی کام کے سلسلے میں حرماگئی چلا گیا عین دوپہر کے وقت ایک مکان کے قریب رک گئے۔ صاحبِ مکان نے آکر ہمیں سلام کیا مگر ان کی پیشانی خاصی شکن آلود نظر آرہی تھی۔ ہمیں سائبان میں بٹھا کر پانی لانے کے لیے زنانہ سائبان میں چلے گئے تو میں نے اپنے رفیقِ سفر سے کہا کہ یہ شخص اپنی اہلیہ سے دبتا ہے، خاتون اس پر حاوی ہے۔ پھر میں نے ذرا بلند آواز سے (تاکہ اس کی اہلیہ تک آواز پہنچے) اپنے ہمراہ سے کہا کہ یہ آدمی بذاتِ خود اتنی بڑی شخصیت کے اوصاف کے حامل نہیں تھا۔ مگر اس کی سلیقہ شعار (شیر زال) بیوی نے اُسے ناموری کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے کہ مشرق و مغرب میں ان کی شہرت کی دھوم ہے، دراصل اس کی ناموری کے پیچھے اس خاتون کا ہاتھ ہے۔ میری یہ باتیں ساتھ والی سائبان میں اس کی بیوی نے سن لیں۔ چنانچہ فوراً چائے دان (چاجوش)

کے کھٹکنے کی آواز آئی، مالک مکان پانی لایا۔ اتنے میں جلدی جلدی چائے بھی تیار ہوکر لائی گئی ۔اب میزبان ہمارے ساتھ بیٹھے باتوں میں مصروف ہے کہ گھر سے بیوی نے اُسے آواز دی کہ اُدھر بیٹھے کیا کر رہے ہو ادھر آجاؤ، مہمانوں کے لیے کوئی بندوبست کیجیے۔ میزبان کے جاتے ہی مرغ کی آواز آئی جسے ذبح کیا گیا۔ ہم دونوں ادھر بیٹھے ہنستے ہوئے چائے نوش کر رہے ہیں کہ تیر نشانے پر لگ گیا۔ اب سو جائیں۔ کافی دیر بعد ہمیں بیدار کیا گیا اور مرغی کے گوشت کا لذیذ کھانا ہمارے سامنے رکھا گیا۔ ہم نے کھانا کھا کر اجازت لی اور رخت سفر باندھ لیا۔ راستے میں میرے ہمراہ نے پوچھا کہ یہ کیا جادو کیا آپ نے؟ میں نے کہا بس عورت سے کام لینے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔

پیشکان والوں کی مہمان نوازی

دوسرا واقعہ یہ سنایا کہ جنوری 1972ء کے رمضان کی بات ہے میں گوادر سے ایک گاڑی پر سوار ہوکر پیشکان کے لیے روانہ ہوگیا۔ افطار کے قریب پیشکان پہنچے ڈرائیور نے مجھے ایک مسجد کے قریب اتارا۔ وہاں ایک پنجابی مؤذن نے اذان دی اور کچھ کھجور اور ایک گلاس پانی سے میری تواضع کی۔ یہ تناول کرنے کے بعد ہم نے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد نہ تو کوئی کھانا لا رہا ہے اور نہ کوئی حال واحوال دریافت کرنے آتا ہے، مجبوراً میں نے بیگ سے ایک چھوٹا سا پیکٹ گوادری حلوہ نکال کر اسی پر گزارہ کیا۔ عشاء کی تراویح ہوگئی تراویح کے بعد میں یہ کہتے ہوئے صف کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا کہ مختصر وقت کے لیے تشریف رکھیں کچھ دینی باتیں کرنی ہیں، لوگ بیٹھ گئے اور میں نے توحید کے موضوع پر وعظ شروع کیا (ہنستے ہوئے کہا کہ کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ نیا مطالعہ نہیں تھا پرانی باتوں اور مطالعہ پر گزارہ کرنا پڑتا تھا) اور وعظ کے آخر میں میں نے کہا کہ ''خاران سے مدرسہ والوں نے مجھے آپ لوگوں کے پاس چندہ کے لیے بھیجا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ یہاں کے لوگ ایک وقت کا کھانا کسی مسافر کو

نہیں کھلا سکتے یہ چندہ کہاں سے دیں گے"

میرے اس جملے نے گویا نشتر کا کام کیا۔ فوراً چندہ جمع کیا گیا جو اس زمانے میں سات سو روپے بن گئے۔ اس کے بعد سب لوگ بیٹھ کر میرا حال واحوال اور تعارف دریافت کرنے لگے۔ ایک معزز آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون سے گاڑی سے تشریف لائے ہو؟ میں نے گاڑی کا رنگ اور اس کی علامات بتائے تو سب لوگ یک زبان ہو کر آدم نامی ایک شخص کو ملامت کرنے لگے کہ یہ تو آپ کی گاڑی ہے۔ آپ کے ڈرائیور نے مولانا کو کسی گھر میں پہنچانے کے بجائے مسجد میں چھوڑ دیا یہ کیسی بے مروتی کی بات ہے۔ لوگوں نے مجھ سے معذرت کی اور پھر خوب میری خاطر مدارات کی گئی اس کے بعد دعوتوں اور بیانات کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔

یہ واقعہ سنا کر حضرت نے مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کیا کہ: کیا تم اس طرح کر سکتے ہو؟ میں نے کہا: میرے بس میں اس طرح کے حیلے کہاں؟

شفقت پدری اور شفقت مادری میں فرق

میرا ایک نجی مسئلہ زیرِ بحث آیا تو اس پر فرمایا کہ شفقت پدری اور شفقت مادری میں یہی فرق ہے کہ باپ کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ میری اولاد کا مستقبل روشن ہو جائے اس کے لیے وہ جتنا ذلیل وخوار ہو جائے، گھر سے دوری کی صعوبت کا سامنا کرے، ذہنی پریشانی کا شکار ہو جائے کوئی بات نہیں، مگر جہد مسلسل اور محنت وعرق ریزی سے کام لے تا کہ وہ ایک ایسا مقام اور ایک ایسی حیثیت پائے کہ بعد میں کسی کا محتاج نہ ہو۔ جبکہ ماں کی شفقت بس اتنی ہوتی ہے کہ اولاد میری نظروں کے سامنے رہے، مجھ سے جدا نہ ہو جائے، چاہے بعد میں بے روزگار ہو جائے، جاہل اور ان پڑھ نکلے، محتاج و بھکاری کی زندگی بسر کرے مگر میری نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ یہ نہایت نادانی اور کم عقلی کی بات ہے۔ مزید فرمایا کہ دراصل اللہ تعالیٰ کی

دو صفات رحمٰن اور رحیم کے مظاہر یہی شفقت پدری اور مادری ہیں۔ رحمٰن شفقت پدری کا منبع ہے کہ دنیا میں مسلمان جتنے بھی ذلیل وخوار اور تنگدستی وزبوں حالی کا شکار ہو جائیں مگر اللہ تعالی چاہتا ہے کہ ان کا مستقبل یعنی آخرت درست اور کامیاب رہے۔ جبکہ شفقت مادری کا سرچشمہ رحیم ہے جس طرح کفار فی الحال دنیا میں عارضی طور پر بڑے عیش وآرام کی زندگی گزار رہے ہیں مگر ان کا مستقبل آخرت میں ابدی نقصان اور ذلت پر مشتمل ہوگا۔ یہ بات بھی مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر الہام الرحمٰن میں موجود ہے۔

الوداعی لمحات اور آخری وصیت

یہ کہنے کے بعد دوبارہ اسی گھریلو مسئلہ کے بارے میں اپنے قیمتی مشورہ سے نوازا اور آخر میں اٹھتے ہوئے کہنے لگے: "اچھا استاد جی اب میں جا رہا ہوں" میں نے سورج کی طرف دیکھا تو وہ غروب ہونے کے بالکل قریب تھا۔ مجھے کیا پتہ کہ میرے سامنے والے علمی آفتاب بھی عنقریب غروب ہونے والا ہے۔ میں چادر اور عصا اٹھا کر حضرت کو تھمانے لگا۔ از راہ تفنن کہا "نہیں بھئی! میرا چادر مجھے دے دو کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے بھی برجستہ کہا: واللہ! ہم سے تو ایک ٹوپی اس روزے کی حالت میں نہیں اٹھائی جا رہی، یہ چادر کون اٹھاتا پھرے گا۔

مسجد کے باہر حضرت کے چپل سیدھے رکھ دیئے۔ چپل پہنتے ہوئے دوبارہ میرے اس گھریلو معاملے پر آخری وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ کام ضرور کر لینا، میں نے کہا انشاءاللہ ضرور کروں گا۔ حضرت مسجد کے جنوبی بڑے گیٹ کی طرف روانہ ہوگئے کہا مجھے تھوڑا چہل قدمی کرنا ہے اور میں مشرقی چھوٹے گیٹ سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ راستوں کی یہ جدائی ہمیشہ کے لیے ہے اور ہنستی مسکراتی اس باغ و بہار شخصیت کی یہ آخری دیدار ہے۔ بحر علوم کی یہ آخری موجیں ہیں اور برسات علم وعرفان کے یہ

آخری قطرے ہیں۔ اس مجلس کے بعد حضرت کا باقاعدہ کوئی مجلس کسی کے ساتھ نہ ہو سکا اور
اسی رات شب جمعہ ۸ رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ بمطابق ۲۵ جون ۲۰۱۵ء سحری کے وقت
اٹھے۔ بشری ضروریات سے فارغ ہو کر بستر پر دوبارہ رو بقبلہ لیٹ گئے۔ صاحبزادہ مولوی
فضل الرحمن صاحب نے فجر کی اذان دی، اس کے بعد آ کر حضرت کو نیند سے بیدار کرنے
لگے۔ جب چند بار آواز دینے پر جواب نہ ملا تو بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ضیاء الرحمن تشریف
لائے، جسم ٹٹول کر دیکھا، ایک اور ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا، نبض وغیرہ دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ
حضرت تو ابدی نیند سو گئے ہیں اعلیٰ علیین میں ان کا روح محو پرواز ہے اب وہ کسی اور مجلس میں
رونق افروز ہو چکے ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اور آج کی صبح کو دیکھ کر کہنا پڑا:

چشم اگر بصبح نہ بیند جمال دوست
گویم کہ صبح تا بہ ابد نادمیدہ بہ

❖☆❖